



جناب مولانا حکیم محمود احمد ظفر صاحب سیالکوٹی

اسلام کا تصورِ نبوت

حکیم صاحب موصوف نے اسلام کے نکھرے ہوئے تصورِ نبوت کو اکابر سلف کی تحقیقات کی روشنی میں پیش فرمایا ہے۔ ہم موصوف کے ممنون ہیں۔ اور اس گرانمایہ مضمون کی تکمیل کی توقع رکھتے ہیں۔ (ادارہ)

جس طرح اسلام میں خدا، آخرت، اعمال اور عذاب و ثواب کا تصور دوسرے مذاہب و ادیان سے جدا اور علیحدہ ہے۔ اسی طرح نبی اور اُس کی نبوت کا تصور بھی اسلام میں دنیا کے سب ادیان سے جدا گانہ ہے۔ کئی مذاہب و ادیان دوسرے سے نبوت ہی کے قائل نہیں اور کئی نظریہ نبوت کے قائل تو ہیں۔ لیکن نبی میں حق تعالیٰ کے حلول و اتحاد اور قرابت و ولادت کے نظریہ کے قائل ہیں۔ جو کہ خالق و مخلوق کی سرحدوں کو آپس میں ملا دیتا ہے۔ کئی مذاہب نبی کو خدا کا وجود تصور کرتے ہیں۔ جو کہ انسانی سیکل میں عالمِ لاہوت سے عالمِ ناسوت میں کچھ خاص اغراض کے تحت جلوہ گر ہوتا ہے۔ کئی مذاہب نبوت کے متعلق کچھ ایسے نظریات رکھتے ہیں۔ جن سے حق تعالیٰ اور نبی کے درمیان کسی نہ کسی طریقہ سے شراکت اور مماثلت کی کچھ نہ کچھ پرچھائیاں ضرور نظر آتی ہیں۔ لیکن نبوت کا جو تصور اسلام نے پیش کیا ہے۔ وہ ان سب ادیان اور مذاہب سے علیحدہ اور بالاتر ہے۔ وہ نہ تو براہمہ کی طرح نبی کو اللہ رب العزت کا اوتار اور بروز تصور کرتا ہے۔ اور نہ ہی عیسائیت کی طرح اس کو ایک عام انسان کی طرح گناہوں سے مآثر گردانتا ہے۔ بلکہ وہ خدا تعالیٰ کو اپنے مقام پر اور نبی کو اپنے مقام پر رکھتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ — ع

گرفن مراتب نہ کنی زندیق

وہ کبھی بھی نبی کو ایسے مقام پر نہیں لے جاتا، جہاں عبدیت اور معبودیت کی سرحدیں ملتی ہوں۔ اور خالق و مخلوق کے مابین شراکت کے شبہات پیدا ہوتے ہوں۔ اور جہاں عیسائیت کی طرح نبی اور حق تعالیٰ کے درمیان کسمپرسی ہو۔

کہ وہ پھر عقلی اور فکری مسئلہ نہ رہے۔ بلکہ ایمان کے بھیدوں میں سے ایک بھید ہو جائے۔ عیسائیت کی تاریخ ہمارے سامنے ہے۔ کہ پہلے تو انہوں نے جناب عیسیٰ علیہ السلام میں الوہیت کی کچھ نشوون و صفات دکھائیں۔ اور پھر جب دنیا کے مفکروں نے عقل و فکر اور علم و خرد کی کسوٹی پر اس کو پرکھنا چاہا تو ایمان کا ایک بھید کہہ کر راہ فراد تلاش کی۔ چنانچہ عقیدہ اتھانیسیس میں جو کہ عیسائی عقائد میں سے ایک بنیادی عقیدہ ہے۔ صاف اور صریح الفاظ میں آتا ہے :

”خدا میں تین شخص ہیں۔ باپ، بیٹا، روح القدس۔ خدا اس پاک تثلیث کا پہلا شخص جو بیٹے اور روح القدس کا شرع ہے۔ یہ تینوں شخص آپس میں بالکل برابر ہیں۔ ان میں کچھ فرق نہیں۔ اس لئے تینوں یکساں الہی عزت کے لائق ہیں۔ لیورع مسیح سچا خدا اور سچا آدمی بھی ہے۔ اور مقدسہ مریم سچے خدا کی ماں بنی۔ باپ خاص کر قادر مطلق اس لئے نہیں کہلاتا کہ وہ زیادہ قدرت والا ہے۔ بلکہ اس لئے کہ پاک نوشتوں میں قدرت باپ کی، دانائی بیٹے کی اور پاکیزگی روح القدس کی کہلاتی ہے۔ (مسیحی تعلیم باب پاک تثلیث ص ۱۹-۲۴ لاہور)

اس خلاف عقل اور خلاف فطرت بات کو جب مفکرین نے فکر و نظر کی نگاہ سے جانچنا شروع کیا تو ان کے اعتراضات سے بچنے کے لئے اور مسیحی بھیدوں کو اپنے سے جدا نہ ہونے دینے کے لئے یہ کہہ دیا :

”ہم اس بات کو ٹھیک نہیں سمجھ سکتے کیوں کہ ایمان کا یہ ایک بھید ہے۔“ (حوالہ مذکور ص ۲۵)

اس کے برعکس اسلام نے جو تصور نبوت پیش کیا ہے۔ اُس میں خالق و مخلوق کی سرحدات الگ الگ ہیں۔ اور ان دونوں کی آپس میں کوئی شراکت نہیں۔

حکیم الامت دہلویؒ نے اس نظریہ کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے —

الوجدان المصریح بحکم بان العبد	وہ جان صریح اس بات کا اقرار کرتا ہے
عبد وان ترقی والرب رب وان	کہ بندہ بندہ ہی ہے خواہ وہ کتنا ہی
تنزل وان العبد قط لا یتصف	ارتقاء منازل کو طے کیوں نہ کر جائے۔

اے عیسائی عقائد کی واقفیت کے لئے میری کتاب ”مسیحیت پر ایک تحقیقی نظر“ (اردو) اور ”Islam's Contribution to Civilization“ (انگریزی) کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔ جو ادارہ معارف اسلامیہ ”سائلو جرائد“ سے مل سکتی ہیں

بالجوبہ او بالصفات اللازمة
اور رب رب ہی ہے۔ خواہ وہ اپنے بندوں
للاجوبہ ہے

کے کتابی قریب کیوں نہ آجائے اور بندہ

کبھی درجہ و جوبہ یا ان صفات کو جو کہ جوبہ کے لئے لازم ہیں، متصف نہیں ہو سکتا۔

اس مسئلہ کو ویسے تو امام ابو الحسن اشعریؒ - قاضی ابوبکر الباقلائیؒ - ابن حزم اندلسیؒ -

ابو اسحق الفرائینی - عبد الکرم الشہرستانی - امام غزالیؒ - امام فخر الدین رازیؒ - علامہ سیف الدین
آمدی ابن خلدونؒ اور ابن تیمیہؒ وغیرہ متکلمین اور محققین اسلام نے اپنی کتابوں میں تفصیل
سے ذکر کیا ہے۔ لیکن متقدمین میں امام غزالیؒ نے "المنقذ من الضلال" اور "مفارج القدس" میں
اور متاخرین میں حکیم الامت شاہ ولی اللہؒ نے "حجۃ اللہ البالغہ" میں نہایت تحقیق اور علمی پیرایہ
میں اس مسئلہ کو بیان فرمایا ہے۔ بلکہ حضرت شاہ صاحبؒ نے تو ہزار برس کی تحقیقات کا عطر
اور نچوڑ "حجۃ اللہ البالغہ" کے چند اوراق کے سینہ میں بند کر کے رکھ دیا ہے۔

نبی کی تعریف | نبوت کے دوسرے پہلوؤں پر گفتگو کرنے سے قبل لفظ "نبی" کی تعریف
کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ بعض کا قول ہے کہ نبی کا لفظ "نبأ" سے

سے مشتق ہے جس کا معنی ہے "اوپنی شے" چونکہ نبی اپنے مرتبہ اور درجہ کے لحاظ سے بہت
اونچے مقام کا حامل ہوتا ہے۔ اس لئے اس کو نبی کہتے ہیں۔ لیکن اکثر کے نزدیک نبی کا لفظ مشتق
ہے۔ "نبأ" سے جس کا معنی ہے خبر۔ لیکن لغت عرب میں ہر خبر "نبأ" نہیں کہلاتی بلکہ "نبأ"
اُس خبر کو کہتے ہیں جس میں تین چیزیں ہوں۔ ۱۔ خبر فائدے کی ہو۔ ۲۔ فائدہ بھی عظیم الشان ہو۔
۳۔ اُس خبر سے سننے والے کو اطمینان قلب اور یقین کامل حاصل ہو۔

اس معنی کی رو سے نبی کی تعریف یہ ہوتی کہ وہ انسان جس نے حق تعالیٰ کے بندوں کو حق تعالیٰ
کی جانب سے اُن کے نفع اور فائدے کی ایسی عظیم الشان خبریں سنائی ہوں جن تک اُن کی نارسا عقل
کی رسائی نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ ایسی باتیں وہی ہوں گی جو اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے ہوں۔ اور پھر ان
خبروں پر اطمینان یا علم اُتو وقت حاصل ہوگا جب خبر دینے والا اُس پر اللہ رب العزت کی طرف سے
کوئی دلیل بھی پیش کرے یا صرف اس کی زندگی ہی اتنی پاکیزہ اور اتنی اعلیٰ اور مقدس ہو کہ اس کے متعلق
کذب کا وہم دگمان بھی نہ ہو سکے اور اس کی بات سننے ہی لوگوں کو یقین آجائے۔ معلوم ہوا کہ صرف
"نبی" کا لفظ ہی لغت عرب کی رو سے ان حقائق پر روشنی ڈالتا ہے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ تعالیٰ نے اس تعریف کو ذرا اور لطیف پیرایہ میں بیان فرمایا ہے۔ فرماتے ہیں :

”اسلام کی زبان میں نبی وہ مقدس شخصیت ہے جسے اللہ سبحانہ و تعالیٰ اپنی مشا اور مرضی بتاتا ہو۔ اور پھر وہ اُن احکام کو دوسروں تک پہنچاتا ہو۔ دین و دنیا کے مصالح اور منافع کے لئے ایک دستور اساسی ، ایک قانون حیات اور ایک نظام العمل پیش کرتا ہو۔ ایک مصلح ہو اور اپنے اندر اصلاحی داعیات بھی رکھتا ہو“ (النبوت ص ۱۲ تا ص ۱۷)

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے نبی کی تعریف میں اور رطافت اور اختصار پیدا فرما دیا ہے۔ فرماتے ہیں :

”نبوت توجہ الی الحق اور توجہ الی الخلق کی صفت کے کمال کا نام ہے۔ دوسرے لفظوں میں نبی وہ ذات ہے جو ہر وقت حق کی طرف بھی توجہ رہے اور خلق خدا پر بھی نظر رکھے۔ حق کی طرف توجہ کرنے سے خلق خدا کی طرف اس کی توجہ کم نہ ہو اور خلق خدا کا خیال حق کی لگن میں خلل انداز نہ ہو“ (مکتوبات)

نبوت کی اس بحث کو حکیم الامت حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ تعالیٰ نے ایک اور انداز میں بیان فرمایا ہے جس کا ماحصل یہ ہے :

”علم و عمل اور فضل و کمال کے لحاظ سے انسانوں کے مختلف درجات ہیں۔ اُن میں سب سے اعلیٰ اور بلند و بالا درجہ ”مفہم“ کا ہے۔ یہ لوگ ایک خاص اصطلاح اور مخصوص طریق اصلاح کے حامل ہوتے ہیں۔ اُن کی قوت ملکیت بہت بلند ہوتی ہے۔ داعیہ حقانی اور صحیح اور سچے جذبات کے ساتھ اُن کے لئے دنیا میں ایک خاص نظام کو قائم کرنا آسان اور سہل ہوتا ہے۔ اور یہ لوگ وہ خاص نظام قائم کرنے کے لئے مبعوث ہوا کرتے ہیں۔ حق تعالیٰ کی طرف سے ان پر علوم عالیہ اور احوال الہیہ کا ترشح ہوتا ہے۔ ”مفہم“ کی سیرت یہ ہوتی ہے کہ وہ معتدل مزاج ہوتا ہے۔ اُس کی تعلقت ، پیدائش اور اخلاق و عادات بالکل صحیح اور درست ہوتی ہیں۔ اس کے اندر جزئی ریلوں اور جزئی واقعات کی بناء پر زیادہ اضطراب نہیں ہوتا۔ وہ نہ تو اس قدر تیز ہوتا ہے۔ کہ صرف کلیات و تخلیات ہی میں الجھ کر رہ جائے۔ اور نہ اس قدر بلید اور غبی کہ صرف جزئیات ہی میں الجھا رہے اور جزئیات سے کلیات تک اور صورت سے روح تک پہنچنا اس کے لئے ممکن نہ ہو۔ وہ سب سے زیادہ سنت راشدہ اور ہدایت کے راستہ کی پیروی کرنے والا ہوتا ہے۔

عبادات میں بھی وہ بلند مرتبے کا حامل ہوتا ہے۔ معاملات میں بھی لوگوں کے ساتھ عدل و انصاف برتنے میں اُس کا معیار بہت بلند ہوتا ہے۔ وہ اپنے فیصلوں میں شخصی اور انفرادی بھلائی کا لحاظ نہیں کرتا۔ بلکہ تدبیر کلی اور منفعت عامہ کا لحاظ رکھتا ہے۔ وہ کسی کو ایذا پہنچانا بالکل گوارا نہیں کرتا۔ اور اگر کسی کو تکلیف اور ایذا پہنچ بھی جاتی ہے تو کسی عارضی سبب کی وجہ سے یعنی یہ کہ منفعت عامہ کا حصول اور بڑی تعداد کا فائدہ چھوٹے سے نقصان سے حاصل ہو تو وہ اس بڑی تکلیف اور اس شخصی نقصان کو گوارا کر لیتا ہے۔ وہ ہمیشہ اپنے امور میں عالم غیب کی طرف مائل اور راعب رہتا ہے۔ یہاں تک کہ اُس کی بات چیت، کام کاج، پھر سے اور پیشانی کے تیوروں سے بھی میلان و رغبت کے اثرات مترشح ہوتے ہیں۔ بلکہ اس کی زندگی کی ہر شان اور ادا سے میلان و رغبت ہی کا اظہار ہوتا ہے۔ وہ ہمیشہ اپنے کو ایسا پاتا ہے کہ عالم غیب سے اُسکی تائید ہو رہی ہے۔ اُسے معمولی اور ادنیٰ سے ادنیٰ ریاضت سے قرب الہی حاصل ہو جاتا ہے۔ اور اس قرب الہی سے اُس پر سکون و طمانیت کے وہ دروازے کھل جاتے ہیں۔ جو دوسروں کے لئے نہیں کھلتے۔

”مفہم“ اپنی مختلف استعداد اور قابلیت کی وجہ سے مختلف مدارج کے حامل ہوا کرتے ہیں۔ اولے۔ وہ مفہم جس کو اکثر و بیشتر ریاضات و عبادات کی وجہ سے حق تعالیٰ شانہ کی جانب سے تہذیب نفس اور تزکیہ نفس کے علوم کی تلقین ہوا کرتی ہے۔ ایسا مفہم ”کامل“ کہلاتا ہے۔ دوم۔ وہ مفہم جسے اکثر و بیشتر اخلاق فاضلہ، تدبیر منزل اور اسی قسم کے دوسرے علوم کا القاء ہوتا رہتا ہے۔ ایسا مفہم ”حکیم“ کہلاتا ہے۔

سوم۔ وہ مفہم جسے عمومی تدبیر و سیاست اور نظام کلی کی اصلاح کے علوم کا القاء کیا جاتا ہے۔ اور اُسے لوگوں میں عدل و انصاف کے نظام کے قیام اور ظلم و جور کے استیصال کی توفیق عطا کی جاتی ہے۔ ایسا مفہم ”خلیفہ“ کہلاتا ہے۔

چہارم۔ وہ مفہم جس پر ملا، اعلیٰ کا نزول ہوتا ہے اور اُسے وہاں کی حضوری حاصل ہوتی ہے۔ وہاں کی تعلیم سے وہ سرفراز ہوتا ہے۔ اور اس سے مختلف قسم کے تصرفات اور خرق عادت امور صادر ہوتے ہیں۔ وہ ”مؤید بروج القدس“ کہلاتا ہے۔

پنجم۔ وہ مفہم جس کی زبان و قلب میں الوار و تجلیات ہوں۔ لوگ اُس کی رفاقت و صحبت اور پند و مرعظت سے مستفید ہوں اور اُن کی ذات ہی تک محدود نہ ہوں

ششم۔ وہ مفہم جس کے علم کا بڑا حصہ امت اور ملت کے اصول و قواعد اور اسکی مصالح و مصلحتوں کی واقفیت پر مبنی ہو اور جس میں ملت کے منہدم ارکان کو دوبارہ قائم کرنے کی طاقت ہو۔
ایسا مفہم "امام" کہلاتا ہے۔

ہفتم۔۔۔ وہ مفہم جس کے قلب میں یہ القاء کیا جائے کہ وہ لوگوں کو اُن بڑے بڑے مصائب و آلام سے خبردار کرے جو دنیا میں اُن لوگوں کے اعمال کے نتیجہ کے طور پر مقدر ہو چکے ہیں۔ مثال کے طور پر کسی قوم کے متعلق اُس کو بتایا گیا ہے کہ وہ اپنی بد اعمالی اور مسلسل نافرمانی کی وجہ سے ملعون و مردود ہو چکی ہے، وہ اس قوم کو اس سے آگاہ کر دیتا ہے۔ یا بعض اوقات اپنے تجرد نفس اور صفائی باطن کی وجہ سے وہ قبر و حشر میں پیش آنے والے واقعات کو معلوم کر لیتا ہے۔ اور وہ اس سے لوگوں کو آگاہ اور باخبر کر دیتا ہے۔ ایسے مفہم کو ”منذر“ کہتے ہیں۔

ہشتم۔ وہ مفہم کہ جب حکمت الہی کا یہ تقاضا ہوتا ہے کہ کسی ایسے مفہم کو مبعوث فرمائے جو لوگوں کو ظلمات اور تاریکیوں سے نکال کر نور اور روشنی میں لائے اور گمراہی اور ضلالت کے راستہ سے موڑ کر ہدایت و اصلاح کا راستہ دکھائے تو حق تعالیٰ اپنے بندوں پر لازم اور فرض کر دیتا ہے کہ وہ اپنے ذہن و قلب کی ساری قوتیں اُس کے حوالہ کر دیں اور ملاءِ اعلیٰ میں بھی تاکید ہوتی ہے کہ جو اس کی اطاعت و فرمانبرداری کرے اس سے خوشنودی اور جو اس کی مخالفت کرے اس سے ناخوشی کا اظہار کیا جائے۔ اور وہ لوگوں کو ان امور سے آگاہ کر دیتا ہے۔ اور اپنی اطاعت و فرمانبرداری لوگوں پر لازم قرار دے دیتا ہے۔ ایسے مفہم کو ”نبی“ کہتے ہیں۔ (حجۃ اللہ البالغہ باب حقیقۃ النبۃ و خواصہا ص ۶۶)

نبی کی ان سب تعریفوں کا عام اور سادہ زبان میں خلاصہ یہ ہے کہ انسان روح اور مادہ کی ترکیب کا نام ہے۔ اس کی روح اور مادہ کی ترکیب نے اس کی حیات کو بھی دو حصوں میں منقسم کر دیا ہے۔ یعنی ایک اس کی مادی حیات اور دوسری اس کی روحانی حیات۔ ان دونوں زندگیوں میں سے ہر زندگی کے طور و طریق الگ الگ ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ جس نے انسان کو زیر حیات سے مرصع کیا اس نے اس بات کی ذمہ داری بھی لی ہوئی ہے کہ اس کی زندگی کی تمام ضروریات کا کفیل میں ہوں۔ چنانچہ فرمایا :

اللہ کے ذمہ ہے۔

رَزَقْنَا۔ (ہود ع ۱)

ایک اور مقام پر فرمایا :

اور جو اللہ سے دُور ہے وہ اس کے لئے

وَمَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَلْ لَهُ مَخْرَجًا

راستہ نکال دیتا ہے۔ اور اُس کو رزق

وَيُؤْتِيهِ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ

ایسی جگہ سے دیتا ہے جہاں سے گمان

(طلاق ع ۱۷)

بھی نہ ہو۔

انسان کی اس مادی حیات کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لئے خلاق عالم نے طرح طرح کے انسان پیدا فرمائے جنہوں نے دوسرے انسانوں کو مادی زندگی بسر کرنے کے طریق سکھائے۔ زندگی بسر کرنے میں جو جو ضروریات انہیں لاتی ہوئیں اُن کو پورا کیا۔ چنانچہ ان حضرات نے انسانوں کو کاشتکاری کے اصول، خورد و نوش کے طریق، ازالہ مرض کی تدبیر، بود و باش کے سامان، سواری وغیرہ کی ضروریات غرضیکہ اُن کی مادی حیات کی تکمیل میں قدم قدم پر انہیں جتنی بھی ضروریات سے دوچار ہونا پڑا۔ ان لوگوں نے اُن کو پورا کیا۔

انسان بیمار ہوا، انہوں نے دوا دی۔ یہ بھوکا ہوا، انہوں نے کھانا کھلایا۔ یہ تنگ ہوا، انہوں نے اس کی عریانی کے ازالہ کیلئے کپڑا بنا کر پیش کیا۔ اس کو دفعِ مصرت کے لئے لٹنے کی ضرورت پیش آئی، انہوں نے اس کو تلواریں، نیزہ اور رائفل وغیرہ آلاتِ حرب ہتیا کئے۔ تاکہ یہ انسان بطریقِ احسن اپنی مادی زندگی کو پایہ تکمیل تک پہنچا سکے۔

اس مادی زندگی کے ساتھ ساتھ اس کی روحانی زندگی کی ضروریات کا جن کو ہم اصولِ تمدن، طریقہ معاشرت، اخلاقِ حسنہ اور تقویٰ وغیرہ کے نام سے موسوم کرتے ہیں، در شروع ہوتا ہے۔ اور یہ حیات ایسی ہے جو صرف حضرت انسان کے لئے مختص ہے۔ مادی زندگی میں حیوان بھی انسان کے ساتھ مشترک ہے۔ مگر اس روحانی زندگی میں انسان کو دیگر حیوانات سے شانِ امتیاز حاصل ہے۔ کیونکہ اگر اس کی یہ روحانی حیات نہ ہو تو اس کی مادی زندگی کی جزّت جہنم بن جائے اور یہ شرفِ المخلوقات جماعت درندوں کا غول اور چرندوں کا گلہ ہو کر رہ جائے۔

————— (باقی آئندہ شمارے میں) —————